پہنچا۔ گھنٹی بجائی۔ اُن کی موم نے بالکونی میں سے جھانکا اور ناگواری سے جھانکا کہ باہر د
تھی اور لُو سے لُوستی ہوئی تھی۔ پیٹر اور پال سیڑھیوں سے نیچے آئے اور آتے ہی
اپنے ہیٹوں کے چھجوں کو چھُو کر کہا "ہاؤ ڈی ـــ"

"یار یہ ہاؤ ڈی بعد میں کر لینا... تمہیں پتہ ہے کہ شیرازی ہوٹل میں روزانہ لنچ
لیے کون آتا ہے؟ ـــ گروچو مارکس۔"

دونوں "ہاؤ ڈی" بھائی ہنسنے لگے "کم آن مین... گروچو مارکس اِن پاکستان...
اِن لاہور اینڈ اِن... شیرازی ہوٹل... یو آر نٹس۔"

اُدھر مشاہد ایک ناراض اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ اُنہیں دیکھتا رہا ـــ "وہ
بھی آئے گا ایک بجے... اینڈ دوئی وِل سی ہواِز نٹس ـــ"

اگلے روز وہ تینوں شیرازی ہوٹل کے باہر دھوپ میں تعینات ہو گئے۔

گروچو مارکس اپنی مونچھیں سنوارتا ہوا ہوٹل سے باہر آیا۔

"بلائی ـــ" پیٹر چیخا "اِٹس ہِم ـــ پال گو برنگ دے آٹو گراف بُک ـــ"

پال نے آٹو گراف بک لانے کے لیے فلیٹ کی جانب دُڑکی لگا دی۔

گروچو بیڈن روڈ کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ہاتھ میں چھڑی اور بغل
ایک فائل، اپنے گیلس کے نیچے انگوٹھے چلاتا ہوا... اور پیٹر اور مشاہد اُس کے پیچھے پیچھے
جب وہ مال روڈ پر سول اینڈ ملٹری گزٹ کے دفتر کے قریب پہنچا تو پال آٹو گراف بُک
سے لگائے ہانپتا ہوا آ گیا۔

پیٹر اور پال دونوں ذرا ہمت کر کے تیز چلتے ہوئے گروچو کے پاس پہنچے، ایک
ڈگ بھر کر عین اُس کے سامنے آ گئے اور پھر ایک گھگھیائی ہوئی مسکراہٹ کے
ہیٹ چھُو کر بولے "ہاؤ ڈی مسٹر ـــ"

گروچو کھڑا ہو گیا اور زیرِ مونچھ نہایت پُرمسرت انداز میں مسکرایا۔

"آٹو گراف پلیز ـــ" پال نے آٹو گراف بُک اُسکی مونچھوں کے عین نیچے فلا
کی... گروچو نے لاہور کی گرم دوپہر میں مال روڈ پر سول اینڈ ملٹری گزٹ کی عمارت
سامنے فٹ پاتھ پر اپنے سامنے کھڑے پسینے سے شرابور تین بچوں کو دلچسپی سے دیکھا اور
میں سے دو کے سر پر بڑے بڑے ہیٹ تھے اور تیسرا نیکر میں تھا۔ گروچو نے آٹو گرا
بک لے کر اُس پر دستخط کئے اور پھر اُن کے گالوں کو تھپک کر چھڑی ٹیکتا چلا گیا۔

پال نے اُسے دُور تک جاتے دیکھا اور پھر آٹوگراف بک کے اُس صفحے کو دیکھا جس پر گروچو دستخط کر کے گیا تھا، وہاں، صلاح الدین احمد، لکھا تھا...

"ہوز دِس گائی؟" پال نے کندھے سکیڑ کر کہا اور بے حد مایوسی سے کہا۔

"آئی ڈونٹ نو —" پیٹر نے جواب دیا۔

"مجھے کیا پتہ —" مشاہد نے فوراً کہا — "لیکن اب بھی میرا یہی خیال ہے کہ یہ گروچو ہے —"

"صرف اُس نے نام بدل لیا ہے — صلاح الدین احمد اِن ڈیڈ —"

پال اور پیٹر مایوس پسینہ پونچھتے ہوئے واپس چلے گئے ہیں۔

رتّی پے ماسٹر کے صدر دروازے کا تھڑا مینشن کراؤڈ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ دھوپ ڈھلتی تو کوئی نہ کوئی مسکیٹئر بازار سے کاپی لانے کے بہانے ادھر آ نکلتا، تھڑے پر بیٹھتا تو سیمنٹ کی گرمی سے بلبلا کر اُٹھتا اور اپنی پشت کو دیر تک سہلاتا فرینک سناٹرا کا کوئی گیت گانے لگتا... پھر ایک اور "ہاؤ ڈی" اپنی ڈھیلی نیکر سنبھالتا نمودار ہو جاتا اور پہلے مسکیٹئر کو کھڑا دیکھ کر جان جاتا کہ ابھی تھڑے کے سیمنٹ میں لاہور کی دوپہر موجود ہے اور وہ بھی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا۔ درمیانی باغیچے یا ڈھول سے اٹی گراؤنڈ میں ایک قدیم برگد تھا اور اُس کے پیچھے اکمل اور اُسکی بہنوں کا گھر تھا۔ اُن سے پرے جی ایم اثر رہتے تھے۔ اِدھر لاری صاحب تھے یعنی جاوید اور ہاتھی دانت کے والد اور مشاہد کے فلیٹ کے سامنے بیکری والے بیرٹ اور اُن کی نازک اور معذور بیٹیاں رہتی تھیں۔ یہ بہت چُپ چُپ نازک اور لڑکھڑاتی ہوئی لڑکیاں تھیں جنہیں چلتے دیکھ کر ترس بھی آتا تھا اور اُن کی قسمت پر رشک بھی آتا تھا اور جب کبھی وُہ گلی میں نکلتیں تو سب لوگ ایک لمحے کے لیے رُک جاتے، سانس نہ لیتے کہ کہیں یہ لمبے سکرٹس اور لمبی سفید باہوں والی لڑکیاں اُن کے سانس لینے سے گر نہ جائیں۔ بیرٹ کی بیکری بیڈن روڈ پر تھی اور اُس کے اندر ابھی تک کھرپلو ڈبل روٹی اور برطانوی راج کی مہک ٹھہری ہوئی تھی۔ خورشید شاہد ہمیشہ بہت بنی ٹھنی اور بالوں میں پھول سجائے اپنے فلیٹ سے نکلتیں اور سرِ شام ہی نکلتیں۔ رتّی کے سیٹ کے برابر میں مولانا محمد حسین آزاد کے پوتے باقر صاحب تھے اور اُن کے بیٹے اکبر صاحب تھے جو اُن دنوں مینشن کراؤڈ کے ممبر تھے۔ باقر صاحب کے عین نیچے تاج کا فلیٹ تھا اور یہ ایک مکمل طور پر Male رہائش گاہ تھی۔ اور بائیں جانب گراؤنڈ فلور پر جس

رہائش گاہ کے برآمدے کی تمام کھڑکیوں کے بیشتر شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اُس میں منٹو صاحب رہتے تھے بلکہ منٹو صاحب سوتے تھے اور صفیہ آپا اور اُن کی دو بیٹیاں رہتی تھیں

باغیچے کے گرد اکثر فلیٹوں کی روشنیاں گُل ہو چکی تھیں۔ تمام لڑکے اپنے گھروں جا چکے تھے لیکن مشاہد ابھی تک رتی کے تھڑے پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وہ اس اندھیرے میں کس طرح اپنے فلیٹ کی باون سیڑھیاں طے کرے گا کیونکہ سیڑھیوں کا اکلوتا بلب ایک مرتبہ پھر چوری ہو گیا تھا اور مشاہد نے سن رکھا تھا کہ لکشمی مینشن میں "باؤ باٹے" ہوتے ہیں۔ یہ "باؤ باٹے" کیا ہوتے ہیں اس کے بارے میں اُسکی معلومات مکمل نہ تھیں صرف اُسے اتنا پتہ تھا کہ باؤ باٹے، باؤ باٹے ہوتے ہیں اور لکشمی مینشن میں رہتے ہیں اور اندھیری راتوں میں چھوٹے بچوں کو سیڑھیوں میں پکڑ کر اُنہیں "باؤ" کہہ کر بے ہوش کر دیتے ہیں چنانچہ ایک تو وہ اپنے دل کو کڑا کرنے کی کوشش میں تھا اور اس کے ساتھ ساتھ آس میں تھا کہ شاید آپا جی پریشان ہو کر ننھے مردان کو اُس کی تلاش میں نیچے بھیج دیں اور پھر وہ مردان کی اُنگلی پکڑ کر کہے کہ تمہیں ڈر تو نہیں لگتا اور اُس کے ساتھ فلیٹ کی باون سیڑھیاں اطمینان سے طے کر لے... اندھیرے میں کوئی اُس کی طرف آیا اور اُس کا سانس رک گیا لیکن یہ کوئی باؤ باٹا نہ تھا تاج تھا۔

"اوئے مشاہد ادھر آ یار — ایک سازش ہے۔"

سازش، تاج کا پسندیدہ لفظ تھا اور وہ ہر وقت اسی سوچ میں رہتا کہ کس طرح کوئی شاندار سازش کی جائے... کوئی بھی دلچسپ چیز یا شخص یا واقعہ اُس کے لیے سازش تھا۔

مشاہد نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور اٹھ بیٹھا "لیکن یار آج پھر مجھے تم سے وہی کام ہے... وہی آوازیں دینے والا —" اور آوازیں دینے والا کام یہ تھا کہ جب کوئی اندھیری سیڑھیوں کو طے کرنے کے لیے مردان کو مدد نہ پہنچتی تو وہ کسی دوست سے گذارش کرتا کہ وہ فلیٹ کے دروازے پر کھڑا ہو کر اُس کا نام پکارتا رہے اور وہ سیڑھیوں پر شُوٹ لگاتا جواب میں... ہاں جی... ہاں میں سن رہا ہوں کہتا ہوا باؤ باٹوں کو جُل دے کر اُس تک پہنچ جائے۔

"ٹھیک ہے یار تم آؤ تو سہی۔"

وہ دونوں مینشن کے گھُپ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر چلتے قریشیوں کے فلیٹ

آ گئے جس کے تھڑے پر کوئی بندہ بیٹھا تھا — اُس کا سفید لباس تاریکی میں بھی دکھائی دیتا تھا۔

"منٹو صاحب ہیں۔ ذرا بیمار ہیں۔ ان کو گھر تک چھوڑ آئیں۔ تم اُدھر سے سہارا دو —"

وہ دونوں اُن کے قریب ہوئے، اُنہیں سہارا دیا اور چلنے لگے... سہارا تو انہوں نے خیر کیا دینا تھا وہ بمشکل اُن کی کمر تک آتے تھے لیکن منٹو صاحب نے اُن کے کندھوں پر بے حد نرمی سے ہاتھ رکھا ہوا تھا جیسے وہ اُن کے دوست ہوں۔ اندھیرے میں اُن کی چپل کچھ گھسٹتی تھی اور اُن کا کلف لگا پاجامہ کورے کاغذ کی طرح کھڑکھڑاتا تھا...

"تم کون ہو بچے —" منٹو صاحب سانس لینے کے لیے رکے اور اُن کے سانس میں کچھ تھا جو مشاہد کو پرایا سا لگا۔

"یہ مشاہد ہے منٹو صاحب — نیا آیا ہے مینشن میں.. ہال روڈ کی سائیڈ پر ہے 17 نمبر میں —"

"اچھا بچہ ہے —" منٹو صاحب نے اُس کے کندھے کو دبا کر کہا۔

تاج نے اُن کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی تو صفیہ آپا فوراً باہر آ گئیں۔ وہ انتظار کر رہی تھیں... گوری چٹی اور ایک خاص بچگانہ معصومیت لیے ہوئے خاتون جن کی عینک بار بار اُن کی ناک پر سے پھسلتی تھی۔

"شاباش بیٹے —" صفیہ آپا نے منٹو صاحب کو وصول کرتے ہوئے تاج سے کہا۔

"یہ مشاہد ہے اور اچھا بچہ ہے —" منٹو صاحب نے اندر جاتے ہوئے صفیہ آپا سے کہا۔ اور اس کے بعد اگلے کئی برسوں میں جب بھی وہ تاج یا کسی اور دوست کے ہمراہ منٹو صاحب کو اُن کے گھر چھوڑنے گیا تو اُنہوں نے ہمیشہ یہی فقرہ کہا "صفیہ یہ مشاہد ہے اور اچھا بچہ ہے —"

لکشمی مینشن کے سہ منزلہ فلیٹوں کی لمبی مستطیل چھت پر مشاہد کی کھلی آنکھوں جو آسمان تھا... وہ بالکل صاف تھا۔ اُس کی نیم تاریکی میں کیا تھا؟ صرف ریگل چوک کے "سینڈرز" کے ریستوران میں سجاوٹ کے قمقموں کی ہلکی روشنی تھی یا موسیقی تھی

اور تماشائیوں کا شور تھا جو اُس تک آتا تھا تو ہلکا ہوتا جاتا تھا۔ اور کچھ نہ تھا... اُسے ابھی یقین نہ آتا تھا۔ آسمان صاف کیسے ہو سکتا ہے... اُس کے چہرے پر راکھ کیوں نہیں ہے کونسی راکھ ہے جو چہرے پر مل دی جاتی ہے اور جن کے چہرے راکھ سے اٹے ہوں وہ اُس راکھ کو دیکھ نہیں سکتے... اُنہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ اُن کے چہروں پر راکھ مل ہے۔ اُن کے نین نقش اب وہ نہیں رہے، اُن کی شباہت بدل چکی ہے... سب دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے راکھ سے اٹے ہوئے چہرے دیکھتے ہیں بولتے نہیں۔ ایک دوسرے کو بتاتے نہیں، پوچھتے نہیں کہ اسی کو تو خاموشی کی سازش ہیں۔

ابھی کچھ برس پہلے کی بات تھی... راکھ کی اور لَو دیتے ہوئے آسمان کی۔

وہ بھاگ رہا تھا۔ اندھا دھند روتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ اُس کا بستہ اُس کے گھٹنے کھٹ کھٹ لگتا تھا اذیت دیتا تھا لیکن وہ رُک نہیں سکتا تھا اور سنسان سڑکوں پر بھاگ رہا تھا۔ اُس کی مس نے کہا تھا کہ شہر میں فساد ہو گیا ہے اور صورتِ حال نازک ہے... وہ کیسے پوچھتا کہ یہ صورتِ حال کیا ہوتی ہے اور اگر یہ نازک ہو جائے تو کیا ہے۔ اُس نے مس کے کہنے پر بستہ اُٹھایا اور سکول سے باہر نکل آیا اور باہر تمام بچوں عزیز و اقارب اُنہیں لینے کے لیے آ چکے تھے لیکن دور دور تک اُس کا شناسا کوئی چہرہ نہ دیتا تھا... جب چوک بالکل خالی ہو گیا تو وہ تیز تیز چلنے لگا ایک بچے کے دھڑکتے خوف ساتھ اور سُوکھے ہوئے حلق اور لڑکھڑاتی ٹانگوں کے ساتھ۔ موچی دروازے کے باہر روڈ ویران تھی اور ایک بچے کو وہ ایک بیابان صحرا دکھائی دی جس میں دوکانیں بند اور درخت چپ تھے اور اُس صحرا میں اُس سرکلر روڈ کے عین بیچ ایک شخص ہاتھ پھیلائے لیٹا تھا اور اُس کے سینے میں ایک چھرا پیوست تھا.... جیسے ایک اداکار خودکشی لیٹ گیا ہو ایک بڑے سیٹ پر جس کے پس منظر میں لاہور شہر کے برج اور مینار ہیں۔ نے اس اداکار کو دیکھا تو اُسکی اداکاری پر خوش نہ ہوا بلکہ اور زیادہ دہشت زدہ ہوا اُس نے اپنے اندر سے خون بہت زیادہ نکالا تھا اور اُسے سڑک پر کچھ اس طرح کہ وہ کسی دنیا کا نقشہ سا لگتا تھا۔

گوالمنڈی کے سہ منزلہ مکان کی چھت بہت چھوٹی تھی اور اُس کے کچے چارپائیاں ساتھ ساتھ بچھائی جاتی تھیں اور اُسے بھی وہی ایک آسمان یاد تھا جو اُن چار

کے اوپر لو دیتا تھا۔

کرفیو، گورکھا پلٹن جو جانے کہاں جاتی ہوئی لاہور آ نکلی تھی اور لاہور کے ہندوؤں کو محمد بن قاسم دکھائی دیتی تھی اور مسلمانوں کے لیے وہ راجہ داہر تھی۔ لوٹ مار، آتش زنی، نعرے اور تھری ناٹ تھری ہندوقوں کی دل دہلانے والی آوازیں... یہ سٹریٹ تھیٹر مشاہد کے آس پاس پرفارم کر رہا تھا لیکن اس کا سب سے بڑا اداکار وُہی تھا جو موچی دروازے کے باہر اپنے سینے میں خنجر گھونپے ایک نئی دنیا کا نقشہ اپنے ٹھنڈے ہوتے خون کے ساتھ بنائے ہوئے لیٹا تھا — وہ کون تھا — ہندو تھا یا مسلمان تھا یا محض اداکار تھا... اس کا End Result کیا ہوا؟ خاک خاک میں اور... مشاہد کے گھر کے اردگرد ہندو لوگوں کی اکثریت تھی۔ گورو ارجن نگر، کرشنا گلی اور گاندھی سکوئر ایسے علاقے تھے جن میں اُن کی بہوؤں کی ڈولیاں اُتری تھیں جن کے صحنوں میں اُن کے بزرگوں کے جنازے اُٹھے تھے کہ وہ اتنے ہی لاہوری تھے جتنے کہ وہ.. جو اُن کے گھروں کو آگ لگا کر اُنہیں وہاں سے نکل جانے پر مجبور کرنا چاہتے تھے کیونکہ یہ وہ تھے جن کے گھروں کو جالندھر اور امرتسر میں آگ لگا دی گئی اور ان میں سے کچھ بالکل مخبوط الحواس تھے اُن کے قافلے لٹے تھے اُن کی بہنوں کو اُن کے سامنے ننگا کیا گیا تھا اور وہ اندھے ہو چکے تھے اور وہ اگرچہ شیکسپیئر کو نہیں جانتے تھے لیکن اندھے ہو جانے کے باوجود یہ اُن کے مجنوں چہروں پر لکھا تھا کہ مرڈر شل بریڈ مرڈر — جی ہاں قتل، قتل کو جنم دیتا ہے.. تاریخ کے اختتام تک... اور ہمیشہ انصاف کے نام پر.... انصاف جو انسانی تاریخ کا سب سے مہلک اور سب سے پُر فریب لفظ ہے۔

اور مشاہد کے کچے ذہن میں شک کی پنیری اُنہی دنوں میں بوئی گئی تھی۔ اُس کے گھر والے اور لاہور والے شاہ شہید کا قصہ بڑے فخر اور نم آلود آنکھوں کی عقیدت کے ساتھ بیان کرتے۔ کیسے گرو ارجن نگر کے باہر ہندو اور سکھ دوکانداروں نے اپنی دوکانوں کے چوبی دروازوں پر ٹین کی چادریں چڑھا کر اُنہیں آتش زنی سے مکمل طور پر محفوظ کر لیا تھا اور کس طرح رمضان کے مقدس مہینے میں کرفیو کے باوجود شاہ صاحب تھانیدار نے مسلمان نوجوانوں کے ایک گروہ کو ان دوکانوں کے دروازے توڑ کر انہیں لوٹ لینے کی اجازت دی تھی اور خود ہمہ وقت پہرہ دیتے رہے اور اس دوران کسی کافر کی گولی اُن کے سینے کے آر پار ہو گئی اور جب جاں کنی کے عالم میں لوٹ مار کرنے والے نوجوانوں نے اُن کے حلق میں پانی کے چند قطرے ٹپکانے کی کوشش کی تو شاہ صاحب نے اشارے سے منع

کر دیا اور نحیف آواز میں فرمایا "میرا روزہ ہے ــــ" سبحان اللہ کیا ایمان کی پختگی ہے

اور انہی دنوں میں شاہ عالمی دروازے کے اندر واقع ایک وسیع اور قدیم آبا
آگ لگا دی گئی۔

یہ بھی ایک ناممکن کارنامہ تھا۔ ہندو شاہ عالمی دروازے کو مکمل طور پر بند ک
محصور ہو چکے تھے اور اُس علاقے کے اندر بقول کسے چڑیا بھی نہیں جا سکتی تھی لیک
ایک جاں باز مجسٹریٹ محمد غنی چیمہ نے جان پر کھیل کر چند مزید جاں بازوں کو شاہ عالم
زیرِ زمین گندے نالے کے ذریعے اندر پہنچایا اور اُنہوں نے اطمینان سے سکونت
کافروں کے مکانوں اور دوکانوں کو آگ لگا دی۔

شاہ عالمی کئی ہفتوں تک جلتا رہا اور کئی مہینوں تک سلگتا رہا۔

مشاہد اِسی بازار کے راستے سکول جاتا تھا اور یہاں زیادہ تر دوکانیں سُنارو
تھیں جن کی نم ٹھنڈک میں موٹی ہندنیاں اور مسلمان عورتیں زیور گہنے بازووں اور
سجائے اپنے آپ کو قدم آدم آئینوں میں حسرت سے دیکھتی تھیں اور ان زیور
حسرت سے اُتار کر رکھ دیتی تھیں... بازار اتنا تنگ تھا کہ اگر ایک دوکاندار دھوپ سے
کی خاطر اپنا سائبان کھولتا تو وہ سامنے والی دوکان کی پیشانی پر جا لگتا...

دن کے وقت شاہ عالمی جلتا ہوا سنائی دیتا تھا اور رات کو وہ دکھائی دیتا تھا۔

گوالمنڈی کے سہ منزلہ مکان کی کچی چھت بہت چھوٹی تھی... اور اُس پر اُن
جو آسمان تھا وہ مشاہد کو یاد تھا... زندگی کے آخری لمحوں تک اُس کی متحرک سُرخی اُ
آنکھوں کے سامنے رہی۔

اِس تاریک آسمان کے کنارے پر ایک اُفق تھا جو گوالمنڈی کے اُس مکا
خوبصورت جالیوں والے کوٹھے پر سے دکھائی دیتا اور یوں دکھائی دیتا کہ گورو ارجن ن
شاندار مکان اور اُن کی ممٹیاں... موچی دروازے کی حویلیاں اور اُن کے درمیان م
کے مینار اور مندروں کے کلس اور شہر لاہور کے برج اور مینار سب کے سب ایسے
ہوتے کہ اُن کے پس منظر میں ایک تیز سُرخی پورے اُفق پر، ایک آہستہ آہستہ حرکت
ہوئی سُرخی اُوپر کو اُٹھتی ہوئی، آسمان کی تاریکی کے اندر الگ جاتی ہوئی، ہر جگہ سے، ہ
سے، گوالمنڈی کے اس سہ منزلہ مکان کے کوٹھے پر سے، اپنی چھوٹی سی چارپائی پ
آنکھوں سے لیٹے ہوئے مشاہد پر وہ سُرخی وہ الاؤ اور وہ آگ کی سرسراہٹ اور کبھی

گڑگڑاہٹ جب کوئی بلند عمارت گرتی... تو یہ سب مشاہد کی کھلی آنکھوں میں اُترتے جاتے
پنی تمام تر گرمی اور حدت کے ساتھ....

لاہور کا آسمان تمام رات روشن رہتا۔ اور اس آسمان پر شاہ عالمی کی جانب سے سیاہ
ندیلے اُڑتے ہوئے آتے... ملبوسات اور بہی کھاتے، کتابوں کے جلے ہوئے اوراق آسمان
ایسے سیاہ پرندوں کی طرح بے بسی سے اُڑتے اور شہر لاہور کی چھتوں پر دھیرے دھیرے
ٹھتے جیسے اُن کے پَر کٹ چکے ہوں۔ آسمان کی مسلسل سُرخی میں یہ جلی ہوئی راکھ اُڑتی
رتی...

مشاہد سویرے جب بیدار ہوتا تو اُس کے منہ پر راکھ ہوتی...

یہ کونسی راکھ ہے جو چہرے پر مل دی جاتی ہے اور جن کے چہرے راکھ سے اَٹے
تے ہیں وہ اِس راکھ کو نہیں دیکھ سکتے... ایک دوسرے کے راکھ سے اَٹے ہوئے چہرے
یکھتے ہیں لیکن بولتے نہیں — کنسپریسی آف سائلنس۔

ایک لُو سے لُو ستی جلتی اور پگھلتی دوپہر کے نچڑتے ہوئے آسمان پر جب زبیر بتو کے
ے کبوتر لکشمی مینشن پر اُڈاریاں مار رہے تھے اور خلق خدا اپنے گھروں میں بند دروازوں
چکوں کے پیچھے اور خس کی ٹٹیوں کی خنک ٹھنڈک کی پناہ میں سوتی تھی تو مرزا بیٹریوں
لے کی گلی میں کھڑے کمال نے اپنے گلے کی تمام تر غدودوں کو بروئے کار لا کر جب
ئے مشاہد" کا نعرلگایا تھا تو غالباً وہ گدھ بھی قدرے ٹھٹکے تھے جو اپنے نیچے لکشمی مینشن
رہائش پذیر قریب المرگ پارسیوں کو حسرت بھری اور بھوکی نظروں سے تکتے تھے۔

مشاہد پسینہ پونچھتا اپنے فلیٹ نمبر 17 کی بادن سیڑھیاں اُتر کر جب نیچے گلی میں آیا
مل اپنی پھٹی ہوئی پتلون کی ہپ پاکٹس میں دونوں انگوٹھے اُڑسے ایک ایسے کاؤ بوائے کی
ح کھڑا تھا جو draw کرنے کو ہے اور ابھی اُسکے سامنے "ہائی نون" کا گیری کوپر آ جائے
لیکن کمال کے سامنے اپنے فلیٹ کی بادن سیڑھیاں اُتر کر مشاہد آ گیا۔

"ہاؤ ڈی" کمال نے اُس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی —

"ہاؤ ڈی کے بچے میں سویا ہوا تھا یہ کوئی وقت ہے کسی کے گھر جانے کا —"

"زندگی اتنی بور ہے کہ میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں تم سے کچھ گفتگو کی جائے"

"کس کی زندگی؟"

"میری اور تمہاری زندگی — تمہاری عمر اس وقت کتنی ہے؟"

"بس نیکر اور پتلون کے درمیان ہے لیکن تمہیں اس سے کیا؟"

"کبھی تم نے سیکس کے بارے میں سوچا ہے؟"

مشاہد نے کمال کو دیکھا جو اپنی پھٹی ہوئی پتلون کی ہپ پاکٹس میں دونوں انگ
اُڑسے ایک ایسے کاؤبوائے کی طرح کھڑا تھا جو draw کرنے کو ہے۔

اُس نے اپنی ہپ پاکٹس میں انگوٹھے اُڑسے اور کمال کو نظر میں رکھے
آہستہ پیچھے ہٹنے لگا اور پھر نالی کے قریب جب اُس کا پاؤں پھسلنے لگا تو اُس نے منہ ٹیڑ
کے نعرہ لگایا "ڈرا —"

کمال نے سر جھٹک کر اور اپنے ہاتھ کو گھما کر شہادت کی اُنگلی کا رُخ مش
طرف کر دیا "ڈز- ڈز — آئی گوٹ یُو —"

"نو... یُو ڈِڈ ناٹ — آئی گاٹ یُو —" مشاہد کو یقین تھا کہ اس پستولی
میں وہ جیتا ہے۔

"آؤ کرکٹ کھیلیں۔"

"اس وقت؟ اس دھوپ میں —"

کمال نے اُسے بیزار اور کچھ حقارت آمیز نظروں سے دیکھا کہ یہ کیا اء
ہے۔

"دھوپ ہے تو کیا ہے یار — وائلڈ ویسٹ میں تو اتنی دھوپ ہوتی ہے ا
کاؤبوائے کو آج تک سن سٹروک نہیں ہوا — اور اگر ہوتا ہے تو ہو جانے دو زندگ
فضول چیز ہے —"

"ہاں —" مشاہد نے سر ہلایا کیونکہ وہ بھی کمال کے فلسفہ بیزاری و بوریت
متاثر ہو رہا تھا "زندگی کتنی فضول ہے — آؤ یار کرکٹ کھیلیں —"

مینشن کی کچی اور کھڈوں والی گراؤنڈ ایک تنور کی طرح تپ رہی تھی اور ا
کے درمیان وہ دونوں ٹاس کر رہے تھے کہ بیٹنگ پہلے کون کرے گا۔ یہ خوش بختی
کے حصے میں آئی اور وہ Manto End پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں پ
دھارے گر رہے تھے اور اُسے سامنے اُدھر جدھر سے کمال اپنا گیند چمکاتا چلا آتا
دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گرمی کی لہروں میں ایک سناٹا اور ایک گہری چپ سی تھی

نے ایک لمبا سٹارٹ لیا اور پھر جس وقت اُس نے مناسب جانا بازو گھما کر گیند مشاہد کی طرف پھینک دیا۔ مشاہد نے بڑے سٹائل سے گھٹنا ٹیکا اور لیگ کی جانب بیٹ گھما دیا ایک چھناکے کی آواز مینشن کے گرم سناٹے میں تمام تر کرچیوں کے ساتھ گونجی۔ مشاہد نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اُسی گھٹنا ٹیک پوزیشن میں برقرار رکھا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ مینشن کی بالکونیوں میں متعدد لڑکیاں اُسے رشک آمیز نظروں سے تک رہی ہیں اور وہ چاہتا تھا کہ وہ اُسے جی بھر کے دیکھ لیں۔ اُن دنوں امتیاز احمد کا گوڈا ٹیک سٹائل لاہوریوں میں بے حد مقبول تھا۔ گیند کسی قسم کا بھی ہو تا باغ جناح میں کرکٹ کے شائقین "گوڈا ٹیک" کے نعرے لگاتے اور امتیاز احمد ان نعروں کے سحر میں آ کر گھٹنا ٹیک کر بلا گھما دیتے... اگر گیند بلے کو چھو جاتا تو شاندار لیگ گلانس ہو جاتی ورنہ اکثر ایل بی ڈبلیو ہو کر موصوف ٹھنڈے ٹھنڈے پویلین میں واپس آ جاتے.. ادھر لکشمی مینشن میں بھی یہی سٹائل فالو کیا جاتا تھا۔ گیند اگرچہ آف پر وائڈ جا رہی ہے لیکن بیٹس مین گھٹنا ٹیک کر اُسے لیگ پر ہی کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے — اور مشاہد آج بے حد خوش قسمت رہا تھا کہ اس سٹائل کی گیند اُس کے بلے کے عین درمیان میں آئی تھی اور زور دار شاٹ کھیلا گیا تھا — مینشن کا سناٹا پہلے کی نسبت زیادہ معلوم ہوا تو اُسے احساس ہوا کہ کمال بالکل غائب ہے اور وہ کڑکتی دھوپ میں گوڈا ٹیکے سٹائل بنائے تنہا کھڑا ہے اور اُسی لمحے ایک کڑکتی ہوئی آواز اُدھر سے آئی جدھر گیند گلانس ہوا تھا — اوئے امتیاز احمد کے بچے — مشاہد کو بے حد دکھ ہوا کہ یہ کون کم عقل اُسے امتیاز احمد کے کھاتے میں ڈال رہا ہے اور اُس نے گرم زمین پر سے بمشکل اپنا گھٹنا اُٹھا کر اُدھر کو ہی دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی اور وہاں برآمدے کے دروازے میں منٹو صاحب کھڑے تھے اور اُبل رہے تھے —

"اوئے اِدھر آ... اِدھر دفع ہو..." مشاہد لرزتا ہوا اُدھر دفع ہوا تو منٹو صاحب نے جھک کر اُس کا کان پکڑ لیا "نشانے لگاتا ہے بے ایمان — بیس شیشوں میں سے صرف تین ہی بچے تھے اور تو نے اُن میں سے بھی ایک توڑ دیا... اوئے توبہ کر۔"

"جناب آپ کان چھوڑیں تو میں توبہ کروں —"

منٹو صاحب نے اُسے گھورا اور پھر اُن کا موڈ کچھ بدلا "آئندہ کرے گا؟"

"نہیں جی —"

"جا پھر دفع ہو جا۔"

مشاہد وہیں کھڑا رہا۔

"جاتا کیوں نہیں؟"

"گیند ——"

"نہیں ملے گا گیند ——" منٹو صاحب پھر جلال میں آ گئے۔

"ساڑھے چار روپے کا ہے جی —— کراؤن کا گیند —— تمام بچے چندہ اکٹھا کر لائے تھے ——"

منٹو صاحب فوراً موم ہو گئے۔ اندر گئے اور گیند لے آئے "خبردار جو آئندہ باقر صاحب والی گلی میں کمال اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

"ہے ناں زندگی فضول چیز —— پہلی گیند پر ہی ٹریجڈی ہو گئی... لیکن شکر گیند واپس مل گیا ورنہ صفیہ آپا —— بھئی بہت جابر خاتون ہیں اُن کے ہاں کم از کم چھ گیندیں ہوں گی ہماری —— بچوں کی بددعائیں لے رہی ہیں خواہ مخواہ.. منٹو صاحب ہیں یار ——"

"اب کیا کریں؟" مشاہد نے پوچھا ——

"بہت بور زندگی ہے یار —— سوچتے ہیں کہ کیا کریں ——"

وہ دونوں باقر صاحب کے تھڑے پر بیٹھ کر سوچنے لگے۔ کڑکتی دھوپ میں کی گرم توا اینٹوں پر مزے سے بیٹھے سوچنے لگے کہ زندگی بہت بور ہے کیا کریں ——

"بکرے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" کمال یکدم اتنا خوش ہوا کہ اُس ناک مزید چوڑی ہو گئی۔

"کونسے بکرے کے بارے میں؟"

"یہی جو اوپر رہتا ہے —— اُسے چھیڑیں؟"

"نہیں یار وہ سویا ہو گا —— دوپہر ہے... زیادتی کی بات ہے۔"

"زیادتی تو بکرے کی ہے ——" کمال چمک کر بولا "ہم دوستوں کے دو اپنے دوست کا بدلہ لیں گے —— چھیڑیں گے بکرے کو۔"

مینشن کراؤڈ اپنی عمر کی وجہ سے، اپنی حماقت کی وجہ سے قدرے بے مینشن کے مکینوں کو نہایت نامناسب ناموں سے پکارا جاتا تھا.. ایک اچھی بھلی مدبر بطخ کہا جاتا تھا بلکہ تاج کا کہنا تھا کہ وہ جب چلتی ہے تو کسی پر یگنٹ ڈک کی طرح چ

بہت بعد میں پتہ چلا کہ بطخ انڈے دیتی ہے... اسی طرح ادھر بننے برادران تھے.. زُوبی بوچز اور جوڑے تھے، لنگڑیاں تھیں، ٹیکسی تھی، ٹاکو تھا۔ ہاتھی دانت بھی تھا اور اِدھر کراوڈ کے ایک اہم ممبر اکبر کے والد باقر صاحب تھے اور تمام بچگان اُن سے نہایت کدورت رکھتے تھے اور اُنہیں بکرا ہی کہا جاتا تھا۔ وہ جب کبھی نظر آتے کسی نہ کسی کونے کھدرے سے کوئی لڑکا... ایک نہایت دلدوز قسم کا "با آ.." کا نعرہ لگا دیتا۔ باقر صاحب سنتے اور یقیناً پیچ و تاب کھاتے ہوئے چپ چاپ چلے جاتے.. اکثر اُن کے فلیٹ کے صدر دروازے پر چاک سے لکھا ہوا اعلان نظر آتا کہ یہاں بکرے کا تازہ گوشت ملتا ہے اور بقر عید پر رواج تھا کہ قربانی کے بعد بکروں کے سری پائے اُن کے دروازے کے ساتھ ایک عید کارڈ کے ہمراہ آویزاں کر دیئے جاتے۔ اور کارڈ پر "بابا بلیک شیپ — " لکھا ہوتا... باقر صاحب سے اتنی زیادہ کدورت کی ایک وجہ ایسی تھی جو صرف ایک بچہ ہی محسوس کر سکتا ہے۔ اُنہوں نے ہمارے دوست کی والدہ سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور دوسری شادی کر لی تھی۔ اکبر کے ساتھ اُن کا رویہ خاصا درشت تھا... اور اکبر ہمارا دوست تھا۔

"چھیڑیں گے بکرے کو —" کمال نے پھر کہا۔

فلیٹوں کی عمارت کے درمیان میں ایک چھ سات فٹ چوڑی گلی تھی جس میں سیوریج کے پائپ نیچے آتے تھے اور کمروں کی کھڑکیاں بھی ادھر کو کھلتی تھیں.. مشاہد اور کمال ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ منصوبہ یہ تھا کہ اُوپر بکرے کے بیڈ روم کی کھڑکی کی طرف بُوتھی اُٹھا کر دونوں باری باری "با آ... با آ" کے نعرے لگائیں اور یوں زندگی کی بوریت کو اِس گرم دوپہر میں کم کریں... سب سے پہلے مشاہد نے منہ اوپر کیا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے ایک عدد "با آ..." کا نعرہ لگایا... اور یہ با آ با آ... مینشن کے گرم سناٹے میں دیر تک گونجتا رہا... پھر کمال نے یہی عمل دوہرایا۔ کمال دراصل سب لڑکوں میں سے بہترین بکرا ایکسپرٹ تھا کیونکہ وہ جب با آ با آ.. کرتا تھا تو جیسے دل کی گہرائیوں میں سے ایک اثر انگیز با آ... نکالتا تھا اور مینشن کے در و دیوار ہلا دیتا تھا۔

"واہ —" مشاہد نے کمال کے با آ.. کی داد دیتے ہوئے کہا "ایک مرتبہ پھر.."

کمال کو اپنے کمالِ فن کی داد ملی تو اُس کا منحنی سینہ پھول گیا اور اُس نے منہ اُوپر اُٹھا کر ایک والہانہ سرخوشی میں مسلسل با آ با آ کرنا شروع کر دیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں

اور وہ کسی اور جہان میں تھا اور بس یہی وہ منحوس گھڑی تھی جب مشاہد نے دیکھا کہ
کی پُشت پر بکرا آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا ہے اور کمال اس بڑھتے ہوئے خط
سے لاعلم بُو تھی اُوپر اُٹھائے باآ باآ کر رہا ہے.. ظاہر ہے بکرے نے اپنے بیڈ روم میں یہ
سنی تھی اور چپکے سے ننگے پاؤں نیچے آیا تھا اور اب اپنے شکار کی جانب بڑھ رہا تھا۔
نے چند بے ربط سے اشارے کیے لیکن کمال کی چونکہ آنکھیں بند تھیں اور وہ
پُرمسرت بُو تھی اوپر اُٹھائے باآ باآ کر رہا تھا اِس لیے اُن کا کچھ اثر نہ ہوا... اب مشا
زندگی بھی خطرے میں تھی چنانچہ وہ ایک اچھے کاؤ بوائے کی طرح اُلٹے قدموں پر پیچھے
گیا اور پھر دُڑکی لگا دی۔ اُسی لمحے کمال کی ایک دلدوز با... سنائی دی اور پھر شاید اُ
گردن دبوچ لی گئی اس لیے.. آ آ... باقی رہ گئی۔

اگلے چند روز کے لیے لکشمی مینشن کی صورت حال بے حد کشیدہ رہی...
نے پہلے تو کمال کی بنفس نفیس مرمت کی اور پھر اُسکے والدین سے شکایت کی چنا
صاحب نے اپنے اس لائق بیٹے کی گوشمالی کی۔ مشاہد کے ہاں بھی شکایت کا سندیسہ
آپ کا برخوردار محلے کے بزرگوں کے بیڈ رومز کے نیچے کھڑے ہو کر بھری دوپہر میں
کے نعرے لگاتا ہے چنانچہ مشاہد کے ابا جی نے بھی اُس کا کان پکڑ کر "کیوں اوئے اُلو"
اور اِس سے زیادہ سخت گیری اُن کے لیے ممکن نہ تھی۔ بس اسی وقوعے کے بع
سازش ہوئی..

اور یہ سازش تاج نے اِنتہائی خفیہ طریقے سے تیار کی۔

خاتون جسے بطخ کے پُروقار نام سے پکارا جاتا تھا باغبانی کی بے حد دلدادہ تھی
کے فلیٹ کے برآمدے کے سامنے سیڑھیوں پر اور فٹ پاتھ پر درجنوں دیدہ زیب
بونوں اور پامز کے گملے سجے تھے۔ بطخ صبح سویرے منہ ہاتھ دھونے سے پیشتر پلاسٹک
ہاتھ میں پکڑے آنکھیں ملتی، اپنے فلیٹ سے باہر آتی اور اپنے پسندیدہ پودوں پر پانی
کرتی... ایک رات گیارہ بجے کے قریب مینشن کراؤڈ کی ایک سیکرٹ میٹنگ ہوئی
میٹنگ میں لڑکیاں بھی شامل تھیں اور یہ سب خواتین و حضرات کُبڑے ہو کر دبے پا
کے سبزہ زار میں پہنچے، سب نے ایک ایک گملا اُٹھایا اور اُسے چند فلیٹ دُور منٹو صاد
فلیٹ کے برآمدے کے عین سامنے سیڑھیوں پر سجا دیا۔ پانچ منٹ کے اندر تمام
صاحب کے فلیٹ کے سامنے بہار دے رہے تھے لیکن یہ تو رات تھی۔ اگلی صبح پو

منہ اندھیرے تاج کے گھر پہنچ چکا تھا اور برآمدے کے شیشوں میں سے بلخ اور منٹو صاحب کے گھروں پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ حسب توقع بلخ آنکھیں ملتی ہوئی پانی کی نالی ہاتھ میں تھامے باہر آئی — باہر گل و گلزار کی بجائے ایک ویرانہ تھا جو صحرائے گوبی سے مماثلت رکھتا تھا۔ سیڑھیاں اور فٹ پاتھ ننگے پڑے تھے۔ بلخ کا منہ کھل گیا اور اُس نے بے یقینی سے آنکھوں کو متعدد بار جھپکا اور ملا اور پھر اُس نے چاروں اور دیکھا اور اُس کی نظر تیر کی طرح منٹو صاحب کے فلیٹ کی سیڑھیوں کی طرف گئی جہاں اُس کا گل و گلزار بہار دے رہا تھا۔ بلخ پھنکارتی ہوئی وہاں پہنچی اور ایک ایک گملے کو پہچان کے مراحل سے گذار کر اُس نے اپنے دبیز کولہوں پر ہاتھ رکھے اور "منٹو وے منٹو" کا آوازہ لگایا۔ اب یہ وقت منٹو صاحب کے بیدار ہونے کا تو نہ تھا اس لیے ادھر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس پر بلخ نے اُن کا دروازہ دھڑ دھڑ کوٹنا شروع کر دیا۔ بالآخر منٹو صاحب اپنے پاجامے کا ازار بند اُڑستے باہر آئے۔ سامنے بلخ کھڑی اُبل رہی تھی اور اُن کی سیڑھیوں پر بہار آئی ہوئی تھی۔ منٹو صاحب شدید حیران اور پریشان کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ سب جس فاصلے پر تھے اور برآمدے کے شیشوں کی اوٹ میں تھے وہاں سے اُنہیں یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ بلخ اور منٹو صاحب کے درمیان کس قسم کی خوشگوار گفتگو ہوئی البتہ ہوا میں تیرتے جو لفظ اُن تک پہنچے اُن میں — شرم نہیں آتی — ادیب ہو کر گملے چراتے ہو اور میں بالکل بے گناہ ہوں اور... شرمندہ ہوں وغیرہ خاصے واضح تھے۔ اِس لمحے منصوبے کے مطابق وہ سب بے حد سرسری اور بے فکرے انداز میں ٹہلتے ہوئے اُن دونوں تک پہنچے اور گملوں کو واپس اُن کے اصلی مالک کے فلیٹ پر پہنچانے کی آفر کی جو قبول کر لی گئی... منٹو صاحب بے حد احسان مند ہوئے کہ یہ نوجوان لڑکے لڑکیاں کتنے شریف اور کتنے مہذب ہیں کہ مجھے اس مصیبت سے نجات دلائی اور بلخ بھی بے حد شکر گزار ہوئی کہ اِن مؤدب بچوں نے رضاکارانہ طور پر اُس کے پیارے گملے واپس اُس کی سیڑھیوں پر رکھ دیئے تھے۔

اُسی شب رات گیارہ بجے مینشن کراؤڈ نے حسب سازش دبے پاؤں چپکے سے وہ تمام گملے ایک مرتبہ پھر منٹو صاحب کے فلیٹ کے سامنے سجا دیئے۔

اگلی صبح صورت حال بے حد نازک ہو گئی۔ بلخ منٹو صاحب پر بے اندازہ برس رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ یہ کیسا اتفاق ہے جو روز ہو جاتا ہے میں پولیس کو اطلاع کروں گی اور ادھر منٹو صاحب بے حد پشیمان معافیاں مانگتے ہوئے اور معذرت کرتے ہوئے۔

اِس بار بھی وہ سب یونہی ٹہلتے ہوئے ادھر نکل گئے اور اچھے بچوں کی طرح اپنے بز
کی مدد کی اور وہ گملے بطخ کے برآمدے تک چھوڑ آئے —

یہ گملا سازش ہمیشہ خفیہ رہی۔ صفیہ آپا نے متعدد بار منٹو صاحب سے دریافت
کہ تم ہر شام قدرے مخمور لوٹتے ہو کہیں اُس حالت میں بطخ کے گملے اُٹھا کر اپنے
نہیں لے آتے اور اگر ایسا کرتے ہو تو کتنی شرم کی بات ہے... اتنے مشہور ادیب ہوا
اور منٹو صاحب قسمیں کھاتے کہ صفیہ... میں ہر چیز ہو سکتا ہوں گملا چور نہیں ہو سکتا۔

اُنہی دنوں مشاہد منٹو صاحب سے بدگمان ہوا...

اُس نے "موذیل" پڑھی اور بدگمان ہو گیا۔

وہ منٹو صاحب کو شریف آدمی سمجھتا تھا لیکن "موذیل" میں ایک مقام پر اُ
نے موذیل کی بڑی بڑی دودھیا چھاتیوں کا تذکرہ کچھ ایسی تفصیل سے کیا تھا کہ یہ ہو
سکتا تھا کہ اُنہوں نے اتنی بڑی چھاتیاں نہ دیکھی ہوں اور پھر بھی اتنی تفصیل سے اُن
لکھا ہو۔ بس یہی بات مشاہد کو کھا گئی — منٹو صاحب نے کہیں نہ کہیں اتنی بڑی چھ
دیکھی تھیں، وہ بے حد جیلس بھی ہوا اور بدگمان بھی.... بہت دنوں تک وہ رتی روشن
دیگر لڑکیوں کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا رہا کہ یہ بھی جب بڑی ہوں گی تو کیا موذ
طرح ہوں گی...

"موذیل" کے بعد وہ جب بھی منٹو صاحب کے سامنے آتا تو کچھ شرمندہ سا
جیسے وہ دودھیا منظر منٹو صاحب نے نہیں اُس نے دیکھا تھا اور پھر وہ اُن کی عینک کے
شیشوں کے عقب میں چمکتی آنکھوں کو ذرا غور سے دیکھتا کہ کہیں ان میں ابھی تک
دودھیا رمق موجود تو نہیں... اُن کی ایک عادت اُسے ہمیشہ یاد رہی... وہ جب بھی چل
ہوتے، چاہے ناک کی سیدھ میں، چاہے ذرا اِدھر اُدھر تو اُن کے راستے میں سڑک ہو
پاتھ ہو، کہیں بھی اگر کوئی اینٹ یا پتھر ہوتا تو وہ جھک کر بڑے اہتمام سے اُسے اُٹھا
"پتہ نہیں کس حرامزادے نے..." کہہ کر ایک طرف رکھ دیتے...

اور اُنہی دنوں منٹو صاحب نے مشاہد کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی...

سمیعہ کے خط والا دردناک قصہ تھا۔

سمیعہ ایک گورے رنگ کی اپنی عمر سے کہیں زیادہ بھری بھری کشمیری لڑکی
اپنے والدین سمیت اور نصف درجن چھوٹی بہنوں سمیت مردان کے فلیٹ سے ایک

ایک فلیٹ کی تیسری منزل پر واقع چھوٹی سی برساتی میں رہتی تھی اور وہاں سے برساتی کی کھڑکی میں سے اگر وہ لوہے کے جنگلے کو مضبوطی سے پکڑ کر آدھے دھڑ سے باہر لٹک جاتی تو اُسے گلی کے پار مشاہد کے فلیٹ کی دیوار پر رکھے ہوئے چیس کے تین گملے نظر آتے اور کبھی کبھار مشاہد کا سر بھی نظر آجاتا جو اُس لمحے گلی میں منتظر اپنے کسی دوست سے باتیں کر رہا ہوتا... آہستہ آہستہ نیچے گلی میں کوئی دوست نہ بھی ہوتا تو مشاہد گملوں کے بیچ میں سے خطرناک حد تک آگے آکر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرتا جدھر سمیعہ رہتی تھی... مشاہد ایک جھینپو اور کچھ ڈرپوک سا بچہ تھا اور سمیعہ یہ جان چکی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اگر اُس نے اِس دُبلے سے گندمی رنگ والے بچے کو اپنی جانب متوجہ کرنا ہے تو اُسے پہل کرنا ہو گی۔
چنانچہ ایک روز جب وہ دونوں اپنی اپنی کھڑکی اور گملوں والی دیوار کے بیچ میں سے نیچے گلی کی جانب عشق پیچاں کی جنگلی بیلوں کی طرح جھول رہے تھے تو سمیعہ نے اپنے آپ کو صرف ایک ہاتھ سے سنبھالے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے مشاہد کو سلام کر دیا... مشاہد کا رنگ فق ہو گیا۔ اُس نے ایک ہندوستانی فلم میں اس قسم کا ایک منظر دیکھا تھا کہ ہیروئن ہیرو کو دیکھ کر باقاعدہ ایک عدد سلیوٹ مارتی ہے اور یوں رومان کا آغاز ہو جاتا ہے اور وہ دونوں ڈوئٹ گانا گانے لگتے ہیں.. مشاہد فوراً پیچھے ہو گیا۔ اُس کا دِل دھکا دھک چلنے لگا اور رنگ بدستور فق رہا.. اُس رات اُسے عجیب سے خواب آئے اور اگلی صبح وہ جانتا نہیں تھا کہ کیسے بستر سے اُٹھے.. سلام ایپی سوڈ کے تیسرے روز اُس کے کسی دوست نے گلی میں سے اُس کا نام پکارا اور وہ دیوار کے اوپر گملوں میں سے جھانک کر نیچے دیکھنے کو تھا کہ اُسے پھر سمیعہ دِکھائی دے گئی، حسب سابق لوہے کے جنگلے کو تھامے کھڑکی میں سے لٹکتی ہوئی اور اس لٹکاہٹ میں اُس کی قمیض کا گلا ایسے کھلا تھا کہ اُسے "سنوز آف کلی منجاروز" کی یوا گارڈنر یاد آ گئی... اور اُس کے سارے بدن کا خون انگیٹھی پر چڑھ گیا اور ایک بڑبڑاہٹ کے ساتھ اُبلنے لگا اور شاید ناک اور کانوں کے راستے یہ گرم خون تھوڑا سا بہہ بھی گیا۔
سمیعہ نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو ایک ہاتھ سے سہار کر اُسے سلام کیا... اور جب وہ اس سلام کے جواب میں اپنا ایک ہاتھ ماتھے تک لے کر گیا تو دیوار پر سے نیچے گلی میں گرنے کو تھا اور پھر اپنے نصیب کے زور پر سنبھل گیا...

دوپہر لاہور کی تھی اور ویسی ہی تھی جیسی کہ لاہور کی گرمیوں میں دوپہریں ہوا کرتی ہیں.. گرم تندور ہوا میں ٹھہری ہوئیں اور اس دوپہر میں مشاہد سکول سے لوٹا۔ پسینے

سے شرابور جب وہ اُس کمرے میں آیا جسے بیٹھک کہا جاتا تھا تو وہاں اُس کی دونوں باجی
یعنی باجی باں باں اور باجی بلقیس کے ہمراہ سمیعہ براجمان تھی اُسی کھلے گلے والی قمیض
ساتھ اور اُسی طرح اپنی عمر سے کہیں زیادہ بھری بھری... مشاہد کا رنگ ایک مرتبہ پھر فق
گیا... لیکن سمیعہ نے اُسے ایسے دیکھا جیسے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ جانے کیسے اُس نے اُس
باجیوں کے ساتھ دوستی گانٹھ لی تھی۔ اور جب اُس نے "ہائے بلقیس بہت دیر ہو گئی۔
کہہ کر جانے کی اجازت چاہی تو باجی باں باں نے برآمدے میں پیڑھی پر بیٹھ کر آپا جی
چولہے کے سامنے دوپہر کی روٹی کھاتے ہوئے مشاہد کو آواز دی، مشاہد ذرا باجی کو نیچے
تک تو چھوڑ آؤ —

اور فلیٹ کی بادن سیڑھیوں کے عین درمیان جا کر باجی سمیعہ نے اُس کا ہاتھ د
کر کہا تھا "اوئے مجھ سے ڈرتے ہو.." اور مشاہد کی گھگھی بندھ گئی اور جب کھلی تو
نے مریل سی آواز میں کہا "نہیں تو —"

"تو پھر مجھے پیاری کہو —"

"آپ تو میری باجی ہیں —" اُس نے گھگھیا کر کہا۔

"اوئے نہیں — کوئی نہیں میں تمہاری باجی شاجی — کونسی جماعت میں ہو

"نویں میں باجی —"

"تو میں آٹھویں میں ہوں — تم سے چھوٹی ہوں — کہو ناں پیاری سمیعہ

اس دوران اوپر سے کسی کے سیڑھیوں سے اُترنے کی آواز آئی اور سمیعہ
جلدی سے اُس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک گچھا مچھا ٹکڑا تھما کر کہا "جان جواب
دینا —"

عشقیہ خط و کتابت جاری ہو گئی۔

اور کئی ماہ تک جاری رہی.. خط کبھی کسی اینٹ کے نیچے اور کبھی چھوٹے
کے ہاتھ...

تو لاہور کی ایک اور دوپہر میں جب وہ دھوپ کی تیزی میں آنکھیں میچے ہا
دہی کا کٹورہ تھامے بیڈن روڈ سے آ رہا تھا تو شیرازی ہوٹل کے سامنے یونہی اتفا
صاحب نظر آ گئے۔ یہ اُن کے نظر آنے کا وقت تو نہ تھا لیکن وہ نظر آ گئے۔

"سلاما لیکم جی —" اُن کے قریب سے گذرتے ہوئے مشاہد نے اُنہیں سر

دیکھا اور ابھی وہ گذرنے کو تھا کہ منٹو صاحب نے اُسے جھک کر کندھے سے پکڑ لیا "یار مشاہد پیسٹری کھاؤ گے؟"

"پیسٹری — ؟" مشاہد کی زبان ذائقوں میں گھل گئی۔ پیسٹری ایک ایسی شے تھی جس کا تذکرہ اُس عہد کے رومانوی افسانوں میں آتا تھا، یہ ایک ایسی خوراک تھی جو لاہور شہر کی فصیلوں سے کم از کم چار پانچ میل باہر صاحب لوگوں کے علاقے میں پائی جاتی تھی اور یا پھر بیڈن روڈ پر واقع بیرٹ پارسی کی نیم تاریک بیکری کہ جس میں برطانوی راج کی بوسیدہ مہک ابھی تک ٹھہری ہوئی تھی کے شیشے کے شوکیسوں میں جلوہ گر ہوتی تھی... پیسٹری... ایک طلسمی شے...

"میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تمہیں پیسٹری کھلائی جائے.. کھاؤ گے؟" منٹو صاحب نے اُسکے چہرے کو پڑھا جس پر "کھاؤں گا کھاؤں گا" لکھا ہوا تھا۔

"ہاں جی کھاؤں گا —"

شیرازی ہوٹل کے اندرون کی ہلکی اور ٹھنڈک والی تاریکی میں گروچو مارکس اپنی مخصوص میز پر بیٹھا چائے کے کپ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ ابھی تک میز پر دھرے سولا ہیٹ کے ٹاپ بٹن کو ٹٹول رہا تھا۔ منٹو صاحب نے گروچو کو مخاطب کر کے کچھ کہا اور گروچو جواب میں اپنی مونچھوں تلے مسکرایا۔

"دو پیسٹری اور ایک چائے —" منٹو صاحب نے ہاتھ لہرا کر ویٹر کو متوجہ کیا لیکن عینک کے شیشوں کے پیچھے اُن کی آنکھیں اپنے سامنے بیٹھے مشاہد پر مرکوز تھیں جو اب اُس لمحے کو کوس رہا تھا جب اُس نے "ہاں جی کھاؤں گا" کہا تھا کیونکہ گھر پر آپا جی وہی کا انتظار کر رہی تھیں اور ادھر منٹو صاحب پتہ نہیں کیوں اُسے اتنی نرم محبت کے ساتھ پیسٹری کھلانا چاہتے تھے۔ اُس زمانے میں بچوں کو خاص طور پر ٹریننگ دی جاتی تھی کہ اگر کوئی شخص آپ کو کہے کہ "مٹھائی کھاؤ گے؟" تو بالکل نہیں کھانی اور اگر کہے کہ پیارے بچے آؤ ذرا میرے گھر چلتے ہیں تو بالکل تنہا اُس کے گھر بالکل نہیں جانا۔ اِن دونوں آفرز میں نوجوان ہوتے بچوں کے لیے طرح طرح کے خطرات مضمر تھے لیکن منٹو صاحب تو کوئی شخص نہ تھے اور نہ ہی اُن کے بارے میں اس قسم کی افواہیں تھیں تو پھر وہ کیوں پیسٹری کھلا رہے تھے...

تھالی میں سجی دو پیسٹریاں جب میز پر آئیں تو گویا ہر طرف بہار آ گئی اور مشاہد کی

آنکھیں اُن پر چپک گئیں۔

"کھاؤ یار مشاہد —" منٹو صاحب بے حد دوستی سے بول رہے تھے "یہ د
تمہارے لیے ہیں" اُس نے گلابی کریم والی پیسٹری پر اُنگلیاں رکھیں تو وہ اُس کی نرم
میٹھی ملائمت میں دھنسنے لگیں اور جب یہ پیسٹری اُس کے دانتوں کے درمیان میں آ
اس کے آسمانی ذائقے سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں... وہ اپنے گلے میں اُترتے
کے میٹھے آبشاروں میں گم آس پاس سے لاتعلق سا ہو گیا اور جب وہ اِس گونا سرخوشی
بلندیوں پر تھا تو منٹو صاحب کی آواز آئی — "یہ... سمیعہ کون ہے؟"

اور مشاہد کی اُنگلیاں لرزنے لگیں اور اُس کا منہ کھُل گیا اور اُس کے ہونٹوں
کناروں پر لگی گلابی کریم پھیل گئی۔

منٹو صاحب اُس کے سامنے بیٹھے مسکرا رہے تھے اور اُن کے ہاتھ میں اردو کی
میں سے پھاڑے ہوئے صفحوں پر لکھا ایک خط تھا "میری جان مشاہد...." منٹو صاحب
پڑھنے لگے اور مشاہد کا پورا بدن خوف سے کانپنے لگا۔ وہ اُٹھ کر بھاگ بھی نہیں سکا
کیونکہ اُس کے ہاتھوں میں دوسری پیسٹری تھی اور اس کی نرمی میں اُس کی اُنگلیاں
تک جا چکی تھیں۔

"میں سیالکوٹ گئی ہوئی تھی اس لیے جان خط میں دو دن کی دیر ہو گئی۔ میر
چاند.. میری جان تم کیسے ہو.. میں نے تمہارے لیے ایک رومال پر پھول بنائے ہیں..
بھیجوں گی مردان کے ہاتھ... مشاہد پیارے ہائے میں تم پر مرتی ہوں..." یہاں آ کر
صاحب رُک گئے اور خط کو تہہ کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے کہنے لگے "ذرا یہ تو بتاؤ
تم پر کس طرح مرتی ہے؟"

"پتہ نہیں جی —" وہ رونے کی تیاری کرنے لگا۔

"تمہارے اُوپر مرتی ہے نیچے مرتی ہے یا درمیان میں مرتی ہے —" منٹو صا
نے بے حد شفقت سے پوچھا۔

"پتہ نہیں جی —" اُس کی آواز بیٹھ رہی تھی۔

"دیکھو بیٹے... گھبرانے کی کوئی بات نہیں.. یہ خط تمہیں مل سکتا ہے..
خط؟"

"جی پلیز — آئندہ نہیں کروں گا۔"

"نہیں نہیں کرو ضرور، آئندہ بھی کرو لیکن صرف مجھے یہ بتا دو کہ تم کیا کرتے ہو؟"

"کہاں جی؟"

"کہاں نہیں — سمیعہ کے ساتھ... کیا کرتے ہو؟"

"کچھ نہیں جی —" یہ منٹو صاحب کس قسم کے سوال پوچھ رہے ہیں....

"چلو میرا تم سے ایک وعدہ ہے، پکا وعدہ — تم مجھے اپنی اور سمیعہ کی کہانی سنا دو.. تم کیسے ملتے ہو۔ مل کر کیا کرتے ہو.. اور اگر پرانے خط تمہارے پاس ہوں... اور وہ ہوں گے تو وہ دے دو میں پڑھ کر واپس کر دوں گا... اور اُن کے ساتھ یہ والا خط بھی —" اُنھوں نے کُرتے کی جیب تھپک کر کہا۔

"میں جاؤں جی —" مشاہد وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

"اور اگر یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم سمیعہ کو مل کر کیا کرتے ہو تو یہ خط تمہارے والد صاحب کو پہنچ جائے گا —" اور یہ کہتے ہوئے اُسے منٹو صاحب بہت بُرے لگے... بُرے سے بھی بہت زیادہ بُرے لگے.. یہ تو اتنے اچھے تھے اِن کو کیا ہو گیا ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ منٹو صاحب مختلف لوگوں کو دوست بناتے ہیں اور پھر کسی کمزور لمحے میں سنائی ہوئی زندگی کی کہانی کو ایک افسانے میں بدل دیتے ہیں۔ اور وہ افسانہ پچیس روپے میں فروخت ہوتا ہے اور.... اُسے یقین تھا کہ اُس کی اور سمیعہ کی کہانی بھی افسانے میں بدلے گی اور پھر ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ... لوہے کے جنگلے کو تھام کر گلی میں لٹکنے والی بھری بھری لڑکی اور چپس کے گملوں میں سے سر نکال کر اُدھر دیکھنے والا لڑکا... مشاہد پسینے میں بھیگ گیا "آئندہ نہیں کروں گا جی..."

"کیا؟"

"کچھ بھی نہیں —"

"نہیں آئندہ تم کیا نہیں کرو گے —" منٹو صاحب کا سر اُس کے قریب آتا گیا اور اب اُس کے جھینپو اور ڈرپوک چہرے اور منٹو صاحب کی عینک کے درمیان صرف ایک لرزتی ہوئی پیسٹری تھی جس کی نرمی میں اُس کی جو اُنگلیاں تھیں اُن پر بھی پسینہ آ رہا تھا۔

"کچھ نہیں جی —" گرمی بہت تھی اور پیسٹری اُس کی اُنگلیوں میں موم کی طرح